شاید

فائزہ افتخار

فائزہ افتخار

حاصل

وہ حویلی آج بھی ویسی ہی تھی جیسی پہلے تھی۔

وہی سرخ اینٹوں کی دیواریں۔۔۔

وہی بوگن ویلیا میں لپٹے کاہی رنگ کے جھروکے۔۔۔

وہی سفید، سرخ، وہی اس کے ستونوں پہ لگی چقیں

۔۔۔ وہی کیلے کے درختوں کے جھنڈ کے اس پار سے

جھانکتے کھنڈر کے مینارے۔۔۔

اور جب میرے قدموں کے نیچے چرمراتے زرد

پتوں نے تو پھر بھی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ نہیں۔

یہ حویلی آج ویسی نہیں جیسے پہلے تھی۔

ناولٹ

سرخ اینٹوں کی دیواروں میں کائی جمی تھی۔

جھروکوں سے لپٹی بوگن ویلیا کسی جوان بیوہ کی اجاڑ کلائیوں کی طرح ٹنڈ منڈ تھی۔

اور اس سفید، سرخ، سبز اور سیاہ چپس کے فرش والے برآمدے کی خنکی میں اب ہڈیوں تک کو جما دینے والی برف تھی اور کیلے کے درختوں کے جھنڈ سے جھانکتے کھنڈر کے میناروں کا بہت سا حصہ بھر بھرا ہو کے گر چکا تھا۔ اور آج اس حویلی میں نہ قلقاریاں تھیں۔۔۔ نہ کسی کی چہکار۔۔۔ ایک سناٹا مکمل سکوت۔۔۔ پردے ہوا سے سرسرا ضرور رہے تھے لیکن شاید ہوا نے بھی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

یہ وہ زمین تھی۔۔۔ وہی آسمان۔۔۔ وہی در و دیوار۔۔۔ وہی پھول پتے۔۔۔ وہی جھروکے۔۔۔ وہی آنگن تھا۔۔۔ جہاں میری محبت نے پہلی بار آنکھیں کھولیں۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند سو رہا تھا مگر یک دم سے اس نے آنکھیں کھول دیں جیسے کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کے جگایا ہو۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔۔۔ مگر کمرے میں سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا وہ دم سادھ کے باہر سے آتی سسکیوں کی آواز سننے لگا۔ یہ سسکیاں جیسے اسے کھینچ کر پہلے بستر سے اتار کے کھڑکی تک لائیں پھر انہی سسکیوں نے اسے پردہ ہٹا کے باہر جھانکنے پہ مجبور کیا۔ ہال میں سامنے والے بڑے سے طاؤسی تخت پہ بیٹھی وہ لڑکی سر جھکائے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اس سے پانچ چھ سال تو بڑی ہو گی۔ شاید پندرہ سال کی یا پھر زیادہ سے زیادہ سولہ سال کی۔۔۔ اس نے چہرہ آگے کر کے کچی نیند سے جاگی آنکھیں سکوڑ کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی وہ چہرہ جو اس کی محبت کا پہلا چہرہ بننے والا تھا۔

مگر بھلا محبت کا چہرہ بھی یونہی آسانی سے نظر آیا کرتا ہے۔ ہونہہ بدھو۔

اس کے ننگے پیر اسے بے اختیار کمرے سے باہر ہال تک لے گئے۔

☆ ☆ ☆

میری نظریں ہال کے وسط میں بچھے اس طاؤسی تخت پہ تھیں جس پہ آج بھی گہرے قرمزی رنگ کا مخملیں بچھونا تھا۔۔۔ دونوں اطراف میں گاؤ تکیے۔۔۔ مگر آج وہ خالی تھا اس پہ وہ نہ تھی۔



ہال میں آج بھی جابجا بہت سی شمعیں رکھیں تھیں۔ مگر سب کی سب بجھی ہوئیں۔

وہی بڑے دادا کی جلالی تصویر۔۔۔ جسے بچپن میں دیکھ کے میں شرارت کرتے کرتے سہم جایا کرتا تھا اور لڑکپن میں دیکھ کے شرارت سے ہنس پڑتا تھا۔۔۔ لیکن آج اس قد آدم تصویر میں جھانکتے بڑے دادا کے نقوش میں جلال نہیں ملال نظر آرہا تھا۔

یہ ہال پوری حویلی کا مرکز تھا۔۔۔ ہمہ وقت بھرا بھرا رہتا۔۔۔ جسے کسی کو ڈھونڈنا ہوتا۔۔۔ وہ ہال میں آجاتا۔۔۔ لیکن آج یہاں کوئی نہیں تھا۔

بس ایک چیز تھی۔۔۔ جو سالوں پہلے بھی تھی آج بھی ہے اور جانے کب تک رہنے والی ہے۔

اس کی سسکیوں کی گونج۔۔۔

میرے قدم مجھے اسی طاؤسی تخت کی جانب لے گئے' جہاں سے کئی سالوں سے اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ میرے ترسے ہوئے ہاتھ اس کے مخملیں بچھونے کو سہلانے لگے۔

اس کی سسکیوں نے پہلی بار مجھے جھنجوڑا تھا مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ کسی اور کے آنسو آپ کے من کو گیلا کیسے کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نائٹ سوٹ میں ملبوس اس نو سالہ بچے کے چھوٹے چھوٹے قدم ہال کے چکنے سفید فرش پر بے اختیار اٹھ رہے تھے اور نظریں طاؤسی تخت پہ اب تک گھٹنوں میں سر دے کر روتی اس سیاہ لباس والی لڑکی پہ مرکوز تھیں۔۔۔ وہ سیاہ رنگ جیسے سارے ہال پہ چھا چکا تھا۔ اسے اس سیاہ رنگ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہال کے وسط میں بچھی سفید چادریں بھی نہیں۔۔۔ ان پہ بیٹھی سیپارے پڑھتی وہ سب آنٹیاں بھی نہیں' جو اب تلاوت کرتے کرتے سر اٹھا کے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اسے ان سسکیوں کے علاوہ کچھ سنائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی ماں نائلہ کی آواز بھی نہیں۔۔۔ جو دوپٹے سے نم آنکھوں کے گوشے خشک کرتی اس سے پوچھ رہی تھی۔

"سعد۔۔۔ بیٹا آپ آج اتنی جلدی جاگ گئے؟" وہ سب کے درمیان سے گزرتا بس اس سیاہ رنگ کی جانب بڑھ رہا تھا جو جلد ہی اس کے وجود کو اپنے رنگ میں رنگنے والا تھا۔

"بس کرو بیٹی۔۔۔ جانے والوں کو آنسوؤں سے تکلیف ہوتی ہے۔" رقیہ خالہ نے اسے تسلی دی اور وہ سوچنے لگا۔

"جانے والوں کو؟ آنے والے کو بھی ہو رہی ہے تکلیف ان آنسوؤں سے۔"

"باپ اور ماں دونوں کو کھویا ہے اس نے' اس اتنی سی عمر میں اتنا بڑا صدمہ۔"

نائلہ نے افسوس سے اس سیاہ وجود کو دیکھا تو وہ بے چین ہو اٹھا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی مت دیکھے اسے کوئی نظر نہ ڈالے اس پہ۔۔۔ سوائے میرے۔"

یہ بے چینی اس کے قدموں میں بجلی بھر گئی اور وہ اگلے ہی پل اس کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ اس کے ہاتھ اٹھے اور اس جھکے ہوئے سر کے بکھرے بکھرے بھورے ریشمی بالوں پہ ٹھہر گئے۔۔۔ اس لمس پہ وہ سسکیاں تھمیں اور اس لڑکی نے سر اٹھا کے اپنے سامنے کھڑے اس حیران آنکھوں والے لڑکے کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ آنسوؤں سے رندھے گلے کو تر کرتا اب اپنا ہاتھ اس کے بالوں سے اس کے رخسار تک لایا اور اپنی انگلی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے احساس تک نہ ہوا کہ اس کے اپنے گال گیلے ہو چکے ہیں۔

نائلہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسری رشتے دار عورتیں بھی اس بچے کے اس عجیب و غریب عمل کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اچانک اسے نجانے کیا

ہوا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اور وہ سیاہ ملبوس والی لڑکی اپنا غم بھول کے اسے سینے سے لگا کر چپ کرانے لگی۔

اب ہال میں دونوں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

وہ میں تھا... سعد رضوان... نو سال کا سعد رضوان ...اور وہ ام ہانی تھی... پندرہ سال کی ام ہانی سلمان... میری ہنی...

پہلا رشتہ آنسوؤں کا تھا۔ اس کے آنسوؤں سے میرے آنسوؤں کا... پھر جب جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے... میرے بھی آنسو بہہ نکلے ... "کیا یہ محبت ہے؟"

میرے سوال نے اس سنسان ہال کو اور بھی اجاڑ اور بیابان کر ڈالا۔

وہ سسکیاں تک سوچ میں پڑ گئی تھیں... تبھی تو ایک سکوت چھا گیا۔ اس جان لیوا سکوت کو توڑنے کے لیے میں نے اپنا سوال پھر سے دوہرایا۔

"کیا یہ محبت تھی؟ کیا یہ محبت ہے؟"

میرا سوال اس سناٹے میں گونج کے رہ گیا۔ اور پھر ہوا نے سرگوشی کی۔

"شاید..."

اور ہوا کی اس سرگوشی نے ہال میں واحد جلتی اس شمع کو بھی بجھا ڈالا... جس کی پگھلتی موم کچھ حرفوں میں ڈھل رہی تھی اور یہ حروف اسی جواب میں ڈھل رہے تھے۔

"شاید۔"

✽ ✽ ✽

رسالپور کے اس نواحی قصبے میں گرمیوں کے آغاز تک بھی راتیں کافی ٹھنڈی رہتی تھیں۔ اور آج تو شام کو ہونے والی ہلکی ہلکی بوندا باندی نے الماری کے اوپر والے خانے میں سنبھال کے رکھی گرم شالیں پھر سے نکلوا دی تھیں۔

نائلہ نے شال اوڑھتے ہوئے بڑی حیرت سے رضوان سے کہا تھا۔ "سعد نے کتنی عجیب حرکت کی۔"

"بچہ ہے... بچوں کا دل نرم ہوتا ہے۔ ام ہانی کا رونا اس سے دیکھا نہیں گیا۔"

رضوان کو ہر بات کی گہرائی میں جانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ قہوے کے گھونٹ بھرتے کھڑکی کے پاس کھڑے باہر اترتی دھند کو دیکھ رہے تھے۔

"ہاں مگر سعد عام بچوں جیسا نہیں ہے۔ وہ تو کبھی کسی بات کو دل پہ نہیں لیتا اور مجھے تو یاد بھی نہیں کہ آخری بار وہ کب رویا تھا اور کل اپنے چچا اور چچی کے ایکسیڈنٹ اور وفات کا سن کے بھی اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا... یونہی کھیل میں مگن رہا جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔"

"ظاہر ہے... اس نے سلمان کا صرف نام سن رکھا تھا چچا سے کوئی وابستگی تھی کہاں... یوں بھی بچوں کے لیے موت اتنی سفاک حقیقت نہیں ہے۔ جتنی ہمارے لیے۔"

"اسی لیے تو حیرت ہے اس کے یوں رونے پر۔" اپنے قہوے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے ہوئے بھی نائلہ ابھی تک اس حیرت میں تھی۔

"نائلہ وہ اکیلا ہے... نہ بہن... نہ بھائی... تم اس

لیے ام ہانی کے یہاں آنے پہ پریشان تھیں کہ پتا نہیں سعد اس کے آنے اور مستقل یہاں رہنے کو کیسا لے گا کہ اب اس کے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی اس گھر میں رہے گا تو تمہارا یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اس نے دل سے ام ہانی کو قبول کر لیا' بلکہ اکیلے پن کی وجہ سے اس میں جو عجیب سی تنہائی پسندی آگئی تھی۔ وہ بھی اب ختم ہو جائے گی۔ اس کا ام ہانی کے دکھ میں رونا ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اب نارمل بچوں کی طرح ری ایکٹ کر رہا ہے۔"

رضوان کے مفصل جواب نے بھی نائلہ کی تشفی نہ کرائی۔

"مگر سوال یہ ہے کہ کیا ام ہانی یہاں ایڈجسٹ ہو جائے گی۔ سعد کے تو صرف بہن بھائی نہیں ہیں۔ ورنہ وہ رہا تو ایک بھرے پرے کنبے میں ہے جبکہ سلمان بھائی نے محبت کی شادی کی بہت بھاری قیمت چکائی۔۔۔ ساری عمر خاندان سے کٹ کے رہے۔ ہم سب ام ہانی کے اپنے سہی۔۔۔ مگر اس کے لیے اجنبی ہیں۔ کیا وہ ہمارے ساتھ رہ لے گی۔"

"سمجھ دار بچی ہے وہ جانتی ہے اب ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے اس کا۔" رضوان اب عادت سے مجبور اس بحث سے ذرا بے زار نظر آرہے تھے۔

"کہیں تمہیں اس کی فکر تو نہیں کہ اب ایک اور ذمے داری تمہارے سر پہ آگئی ہے؟" اور اس سوال نے تو نائلہ کے دماغ کا فیوز ہی اڑا دیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں اتنی کم ظرف ہوں؟" اس نے قہوے کی پیالی میز پہ پٹخی اور ہو گئی شروع۔

جب سے بیاہ کے آئی ہوں ذمے داریاں ہی تو نباہ رہی ہوں۔۔۔ ساس سسر کی۔۔۔ پھر دادا جان ہیں اور ہاں وہ آپ کی ہمشیرہ ایک مستقل عذاب۔"

رضوان نے کمبل منہ تک تاننے میں ہی عافیت سمجھی۔ نائلہ نے سر جھٹک کے بڑبڑاتے ہوئے قہوے کی پیالی دوبارہ اٹھائی۔

"ہونہہ۔۔۔ ہمشیرہ صاحبہ کے ذکر پہ چپ سادھ لیتے ہیں۔" مگر نند کے تذکرے نے منہ کا ذائقہ ایسا کڑوا کر دیا تھا کہ قہوہ بھی تلخ سا لگنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اور رضوان کی ہمشیرہ مہ پارہ بیگم کے مزاج کی تلخی تو کسی کے تذکرے کے بہانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ خدا کا خاص کرم تھا ان پر۔۔۔ اس وقت بھی ماتھے پہ بل ڈالے۔ اپنی ستواں ناک کو ایک خاص زاویے تک چڑھائے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے مختلف شیلفوں میں سے رنگ برنگ کی دوائیں اپنی ہتھیلی پہ نکالتی جا رہی تھیں۔ اور بڑے سے نواڑی رنگلے پلنگ پہ لیٹے بڑے دادا کھانستے تھے۔۔۔ آہ بھرتے تھے۔

"ھک ھا۔۔۔ میں بڈھے دیلے جوان اولاد کے صدمے اٹھانے جوگا ہی رہ گیا۔۔۔ بیٹے پتر گیا پھر اب جوان پوترا۔۔۔ جانے کی عمر تے میری تھی۔"

"تو چپ جاتے ناں۔"

مہ پارہ نے بڑبڑا کے گلاس میں پانی انڈیلا۔۔۔ پانی کے چھینٹے گلاس میں چھن چھن گرنے کی آواز میں مہ پارہ کی بڑبڑاہٹ نہ بھی دبتی تو تب بھی بڑے دادا کی سماعتیں اب ایسی نہ رہی تھیں کہ وہ سن پاتے۔

"کی کہیا؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ یہ دوائیں کھالیں۔ یہ نیلی والی گولی۔۔۔ یہ رہی سفید والی گولی اور یہ پیلی گولی۔"

اس نے پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس کے سے انداز میں گلاس آگے کیا۔ قطرے چھلک کے بڑے دادا کے کرتے پہ گرے۔

"یہ گولیاں بھی ایسے دیتی ہے جیسے گولا مار رہی ہو۔ بڈھے دادا کی خدمت کرنا تجھے بار لگتا ہے پوری حویلی میں اور کام کیا ہے تجھے۔"

چلا کے بولنے سے ان کی پسلیوں نے احتجاجاً دوبارہ کھانسی کا دورہ شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

یہ بڑے دادا تھے۔ یعنی دادا کے بھی بڑے۔۔۔ میرے ابو رضوان کے دادا۔۔۔ جب سے ہوش سنبھالا

تھا انہیں اسی رنگلے نواڑی پلنگ پہ۔ کبھی کھانستے تو کبھی ڈانٹتے ہی دیکھا تھا۔ ان کی جوانی کی یادگار ایک بارعب اور جلالی تصویر ہال میں آویزاں تھی۔۔۔ اور یہ جلال اور رعب صرف اس تصویر میں نہیں تھا۔ بڑے دادا کے مزاج سے آج بھی سب خائف رہتے تھے۔ وہ دواؤں کے سہارے چل رہے تھے اور پوری حویلی کو چلا رہے تھے۔ آج بھی ابو ان کی اجازت اور مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ مہ پارہ پھوپھو کی شادی بھی۔

ہمارے خاندان میں شادی بیاہ کے معاملات آپس میں ہی نمٹائے جاتے ہیں۔ پھوپھو کی قسمت۔۔۔ ان کے جوڑ کا یا تو ذات برادری میں کوئی تھا ہی نہیں۔ یا تھا تو ان کو نہ ملا اور باہر سے آئے رشتے کے لیے کبھی بڑے دادا مانے ہی نہیں۔۔۔ ابو کے دبے دبے دلائل کے باوجود۔۔۔ اور یہ اصول صرف گھر کی عورتوں کے لیے نہیں تھے۔۔۔ سلمان چچا نے جب اپنی پسند سے انہیں آگاہ کیا تو ان کے آڑے بھی یہی اصول آئے۔ مگر وہ کوئی مہ پارہ پھوپھو تھے جو ماتھے پہ بل لے کر بڑبڑاتے ہوئے حویلی کی دیواروں میں تلخ زندگی گزار دیتے۔۔۔ انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پہ اپنی پسند کو اپنایا اور اسی پاداش میں انہیں خاندان سے الگ کر دیا۔۔۔ ساری زندگی انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ایبٹ آباد میں گزاری۔۔۔ ابو ان سے رابطے میں رہے۔۔۔ شاید کبھی کبھی چھپ چھپ کے مل بھی آتے تھے، مگر بڑے دادا سے ان کو کبھی معافی نہ دلا سکے۔۔۔ یہاں تک کہ چچا اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ ایک کار حادثے کا شکار ہو کے یہ دنیا ہی چھوڑ گئے۔ اور ان کی اکلوتی بیٹی ام ہانی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حویلی میں آ گئی۔

نہیں شاید۔۔۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی میں بھی۔

اس کی روئی روئی آنکھیں اداس اداس چہرہ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔۔۔ میں خود خاصا آدم بےزار اور سڑیل قسم کا بچہ تھا۔۔۔ لیکن اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لانے کے لیے ہر جتن کرنے پہ تیار تھا۔۔۔

اس کی خاطر جو کر تک بنے پہ... میں جو کمرے میں گھسا گیمز کھیلا رہتا تھا اب کبھی اس کو چھت پہ پتنگ اڑا کے دکھا رہا ہوتا تو کبھی اس کے لیے آم کے درخت پہ چڑھا کیریاں توڑ رہا ہوتا۔ اسے آنکھ مچولی کھیلنا بہت پسند تھا اور مجھے اسے آنکھوں پہ دوپٹا باندھے میری تلاش میں گھومتے دیکھنا۔۔۔ اور میں چپ چاپ ایک جگہ کھڑا اسے تکتا رہتا۔ چھپنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔۔۔ بھلا میں اس کی نظروں سے اوجھل کیوں رہنا چاہتا اور جب وہ مجھے کاندھوں سے تھام کے خوشی سے چلاتی۔

"ڈھونڈ لیا میں نے۔۔۔ سعد مل گیا مجھے۔" تو میرے اندر سکون سا اتر آتا۔۔۔ میں اسے مل جانا چاہتا تھا۔

اور ایک میں ہی تو تھا پوری حویلی میں جس کے ساتھ وہ باتیں کرتی تھی۔ ہنستی تھی۔ کھیلتی تھی۔۔۔ باقی سب کے ساتھ وہ کھل ہی نہ پا رہی تھی۔ امی اس کا بے حد خیال رکھتیں' ابو اس پہ اتنا پیار لٹاتے' بڑے دادا تو لگتا تھا سلمان چچا کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کی تلافی اسی کے لاڈ اٹھا کے کرنا چاہتے تھے۔ بس ایک مہ پارہ پھوپھو تھیں جو ذرا لیے دیے رہتیں اس کے ساتھ۔ مگر وہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ان کا رویہ سب کے ساتھ ہی ایسا تھا اس معاملے میں وہ رواداری اور انصاف سے کام لیتیں۔ سب کو ایک سی بے مروتی اور سرد مہری سے نوازتی تھیں۔ پھر بھی وہ جیسے اپنے اندر سمٹی رہتی وہ اپنے نہیں' کسی اور کے گھر میں رہ رہی ہے۔ ایک ایسے گھر میں جہاں اس کی ماں کو کبھی قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی۔ ایک ایسے گھر میں جس کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس کے باپ پہ بند کر دیے گئے تھے۔ یہ احساس اس کے اندر سے نہیں جاتا تھا۔

حویلی کی نسبت وہ حویلی کے پچھلے گوشے والے اس کھنڈر نما حصے میں زیادہ خوش تھی۔ جو بڑے دادا کے بھی دادا کے وقتوں کی یادگار تھا۔ اس کی خاطر میں بھی وہیں جانے لگا اس کے ساتھ۔۔۔ اور چونکہ اس کا دل وہاں لگتا تھا میرا بھی لگنے لگا۔ ہم نے اس کھنڈر کو ایک نام دیا۔۔۔ خواب نگر۔۔۔ یہ خواب نگر ہمارا تھا۔۔۔ ہم دونوں کا۔۔۔ ہم پہروں یہاں بتا دیتے۔ وہ کالج سے اور میں اسکول سے آنے کے بعد کتابیں بھی یہاں اٹھا لاتے۔ پڑھتے' کھیلتے' باتیں کرتے۔۔۔ اسے دیواروں پہ کارٹون بنانے کا بہت شوق تھا۔ بہت اچھی ڈرائنگ بھی تھی اس کی۔ جب دل چاہتا کمال قسم کے اسکیچز اور پینٹنگز بھی بناتی۔۔۔ مگر خواب نگر کی شکستہ دیواروں پہ صرف کارٹونز۔۔۔ مزے مزے کے کارٹونز اور میں۔۔۔ میری ڈرائنگ تو ہمیشہ سے بہت بری تھی ۔۔۔ مگر اس کے لیے کچھ تو کرنا تھا میں نے۔۔۔ ایک دن چاک اٹھایا۔۔۔ اور ایک دیوار پہ اس کا اور اپنا نام لکھ دیا ۔۔۔ اس سے کچھ دیر پہلے میں کسی بات پہ اس سے ناراض ہوا تھا۔ نہیں۔۔۔ ناراض نہیں ہوا تھا۔۔۔ ناراض ہونے کا ڈرامہ کر رہا تھا تاکہ وہ مجھے منائے اور اس نے مجھے منایا۔ میں مان گیا پھر اپنا اور اس کا نام دیوار پہ لکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"بس۔۔۔ آج کے بعد جب بھی ناراضی کے بعد ہماری پھر سے دوستی ہوا کرے گی۔۔۔ میں یہاں اپنا اور تمہارا نام لکھوں گا۔" وہ ہنس پڑی تھی۔

"بدھو۔۔۔ پھر تو جلد ہی یہ سب دیواریں تمہارے اور میرے نام سے بھر جائیں گی۔۔۔ پھر میں کارٹونز کہاں بناؤں گی۔"

"تو ہم کم کم ناراض ہوا کریں گے ناں۔۔۔"

میں نے حل نکالا اور وہ پھر سے ہنس پڑی اور زمین پہ کوئلے سے لکیریں کھینچنے لگی۔ یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا اسی سے متعارف ہوا تھا میں اس کھیل سے اور اس کا نام سن کے ہنس بھی پڑا تھا۔

"اشٹاپو۔۔۔ یہ کیسا گیم ہے بھلا۔۔۔ کتنا فضول نام۔"

"بدھو۔۔۔ تمہیں کیا پتا تم اپنے روم میں بیٹھے بس ویڈیو گیمز کھیلا کرو۔۔۔ جو مزا ایسے کھیلوں میں ہے وہ ویڈیو گیمز میں کہاں۔"

پھر میں بھی اکثر اس کے ساتھ اشٹاپو کھیلنے لگا اور اکثر رات کو وہ مجھے کہانی بھی سنایا کرتی۔ مجھے کہانی سننے سے زیادہ کھلے آسمان کے نیچے ستاروں کی چھاؤں میں' آنگن میں بچھے پلنگ پہ اس کے برابر لیٹ کرا سے

محسوس کرنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔

"اس کے زخم گہرے تھے مگر شہزادی کو محسوس نہ ہوئے کیونکہ شہزادہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس لیے اس کے زخم بھرتے گئے۔"

"تمہارے زخموں میں بھی کبھی درد نہیں ہوگا ہنی ۔۔۔ کیونکہ میں بھی تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"

میں نے کہانی میں دخل دیا تو اس کی کھلکھلاہٹ دور اوپر ستاروں سے جا ٹکرائی۔

"بدھو۔۔۔ وہ والی محبت نہیں شہزادے کو شہزادی سے دوسری والی محبت تھی اور قسم کی۔"

"کیا محبت کی بھی قسمیں ہوا کرتی ہیں ہنی؟"

یہ میرا پہلا سوال تھا جس نے اسے لمحے بھر کے لیے چپ کر دیا تھا۔ پھر اس کے لبوں سے ایک سرگوشی سی آزاد ہوئی۔

"شاید۔"

✡ ✡ ✡

اور میں اس ویرانے میں کھڑا ہوں۔۔۔ اسی بازگشت میں۔

"شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید۔"

میں نے اس حویلی کے سنسان' اجاڑ ویرانے میں کسی کو کھوجنا چاہا۔۔۔ کسی بھی جانب کوئی نہیں تھا اور ہر جانب وہ تھی۔

اس کے ہونے اور اس کے نہ ہونے کے درمیان ہی معلق تھا میں کب سے۔۔۔

"ہاں۔۔۔ محبت کی بھی قسمیں ہوا کرتی ہیں۔" مجھے طاؤسی تخت پہ پھر سے سیاہ وجود سسکیاں لیتا نظر آیا۔

"کہیں محبت عبادت کے وضو سے پاک ہوتی ہے۔" اور پھر مجھے برآمدے کے سرخ' سبز' سفید اور سیاہ چپس والے سرد فرش پہ وہ جائے نماز بچھائے سفید دوپٹے کے ہالے میں سجدہ کرتی نظر آئی میرے قدم آگے بڑھے۔

"تو کہیں محبت' غرض کے کالے بادلوں میں دھندلائی ہوئی ہوتی ہے۔"

اور جیسے ہی حسد' غرض اور رقابت کی آگ سے سیاہ ہوتے چہرے والے سعد رضوان پہ میری نظر پڑی ۔۔۔ میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ اس بے پناہ مکروہ چہرے کو دیکھ کے میں نے حیرت سے سوچا تھا۔ کیا واقعی یہ میں تھا؟

"کہیں محبت ہوس کی تپش سے گھبرائی ہوتی ہے۔"

اور دور کہیں ہانی کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔۔۔ زرد لباس میں مایوں کی دلہن ہراساں چہرے والی ام ہانی۔۔۔ اور وحشت کے عالم میں اسے کاندھے سے پکڑ کے جھنجوڑتا سعد رضوان۔

"اور کہیں محبت طلب کی پیاس میں بے کل۔"

میں نے گھبرا کے اس کے کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے نظر ہٹائی تو سامنے ایک اور مکروہ منظر تھا۔

شکست خوردہ' زخم خوردہ' مایوس سعد رضوان آنسوؤں کے ساتھ روتا گڑگڑاتا ام ہانی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور وہ اس کی وحشت و دیوانگی سے سہمی لرز رہی تھی۔

"اور کہیں۔۔۔ کہیں محبت نفرت کے زہر میں ڈوبی ہوئی۔"

اور جب دھندلی آنکھوں کے سامنے دلہن بنی ام ہانی نے سعد رضوان کو شدت کے ساتھ تھپڑ دے مارا تو میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور آنکھیں بند کرلیں ۔۔۔ مگر بند آنکھیں اور بہت کچھ دکھانے لگیں۔

✡ ✡ ✡

"کیوں جاؤں میں ہاسٹل؟"

میں جھنجلا اٹھا تھا ابو کے اس نئے آرڈر پہ۔ مگر ان پہ میری جھنجلاہٹ اور احتجاج کا کوئی اثر نہ پڑا۔

"کیونکہ میں کہہ رہا ہوں۔"

ان کے لہجے کی سختی اور قطعی پن کا اثر زائل کرنے کے لیے امی نے وہی بات ذرا مکھن میں بھگو کے کی۔

"تمہارے ابو نے تمہارے مستقبل کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا ہے سعد یہاں اس چھوٹے سے شہر میں تم کیا تعلیم حاصل کرو گے؟"

"اچھا؟ تو جب بنی نے لاہور جا کے NCA میں ایڈمیشن لینا چاہا تھا تب آپ سب نے مخالفت کیوں کی تھی اور یہ کیوں کہا تھا کہ ایسی کون سی پڑھائی ہے جو اس شہر میں رہ کے نہیں ہو سکتی۔"

"سعد' وہ لڑکی ہے۔" امی نے جیسے اپنی دانست میں کوئی انکشاف کیا تھا مجھ پہ۔

"اچھا' تو وہ لڑکی ہے اس لیے اس کے فیوچر کی کوئی پروا نہیں۔۔۔ میرے فیوچر کی ہے؟ میں نہیں جانے والا نہیں۔"

دو ڈھائی سال پرانا مقدمہ نکال کے میں اب لڑ رہا تھا اس کی حمایت میں وہ بالکل صحیح مجھے بدھو کہتی تھی۔

"سعد۔۔۔ تم۔"

اس سے پہلے کہ ابو ڈانٹ کا ایک لمبا سیشن شروع کرتے امی نے ان کا ہاتھ دبا کے انہیں منع کر دیا۔

"میں بات کرتی ہوں رضوان۔"

"پاگل ہو گیا ہے کیا یہ؟"

"گھر سے دور کبھی نہیں رہا ناں۔۔۔ اس لیے۔"

"تو کیا ساری عمر تمہاری گود میں بیٹھا رہے گا۔"

ان کو بحث میں الجھا دیکھ کے میں پیر پٹختا وہاں سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اور بھلا دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ام ہنی سے بہتر سانجھ اور خواب نگر سے بہتر جگہ اور کون سی تھی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں وہ۔۔۔ یہاں کیا پڑھ ہو گے تم؟"

کوئلے سے دیوار پہ کارٹون بناتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"وہی۔۔۔ جو تم نے پڑھا۔"

"بدھو۔۔۔ میں نے تو ہسٹری اور لٹریچر کے ساتھ بی اے کیا اور تم نے کرنی ہے انجینئرنگ اور اس کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہو گا۔"

"تم بھی تو آرٹسٹ بننا چاہتی تھیں اور اس کے لیے نیشنل کالج آف آرٹس جانا چاہتی تھیں۔۔۔ مگر تمہیں تو کسی نے اجازت نہ دی۔"

"تو میں بن تو گئی آرٹسٹ۔" وہ کوئلہ پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے فخر سے مجھے دیوار پہ بنا کارٹون دکھانے لگی۔

"یہ دیکھو۔۔۔ مگر انجینئر ایسے خود بخود نہیں بنا جاتا۔"

"نہیں تو نہ سہی۔۔۔ نہیں بنوں گا۔ اگر اس کے لیے ہاسٹل جانا شرط ہے۔" میں اڑا ہوا تھا وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔

"سمجھ گئی۔۔۔ تم کیوں نہیں جانا چاہتے۔" اس کی بات پہ میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اچھا۔۔۔ تو تم واقعی جانتی ہو کہ وہ کیا ہے جو مجھے یہاں باندھے ہوئے ہے۔۔۔ کیوں نہیں جا سکتا میں دور؟"

"ہاں۔۔۔ تمہارا ڈر۔۔۔" اس کے اطمینان بھرے جواب پہ میں جل اٹھا۔

"ڈر؟"

"ہاں ناں۔" وہ میرے جلنے کڑھنے کا مزا لے رہی تھی۔

"ڈرتے ہو اکیلے رہنے سے۔۔۔ چہ چہ۔۔۔ بے چارہ ننھا سا بچہ۔۔۔ کیسے رہے گا اکیلے۔"

"میں بچہ نہیں ہوں سمجھی۔۔۔ آئی بڑی۔" میری ناراضی پہ وہ ہنس پڑی۔

"ہاں۔۔۔ ہوں تو بڑی اور تم چھوٹے۔"

"اچھا؟ ذرا اٹھنا تو۔" میں جھٹ کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے بھی اپنے برابر کھڑا کرنے کے لیے کھینچنے لگا۔

"یہاں کھڑی ہو ذرا۔۔۔ ساتھ ایسے اب بتاؤ یہ میں چھوٹا ہوں؟ تم چھوٹی ہو پورے پانچ انچ۔"

"اور تم پورے پانچ سال۔۔۔ اتنا ہی شوق ہے نہ بڑا بننے کا تو جاؤ۔ جا کے دکھاؤ ہاسٹل اور رہو اکیلے۔۔۔"

وہ چڑا بھی رہی تھی اور اکسا بھی رہی تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بھی اکسانے کی کوشش کی۔

"سوچ لو۔۔۔ چلا گیا تو یاد آؤں گا تمہیں۔"

"آجانا... میں خوشی خوشی کرلوں گی تمہیں یاد۔"

اس کے اطمینان نے مجھے تاؤ دلا دیا اور میں نے فوراً" ہی جانے کا فیصلہ کرلیا' ٹھان لی کہ اب اسے یاد آ کے رہوں گا اور ایسے یاد آؤں گا کہ مزا چکھادوں گا اور بھیجے مجھے دور....

☼ ☼ ☼

"یہ سب چھوڑو سلمٰی اور پہلے جا کے وہ سارے کپڑے پریس کردو جو میں نے سعد کے نکال کے رکھے ہیں... مجھے پیکنگ کرنی ہے اس کی۔"

نائلہ نے آتے ہی سلمٰی کی گلوخلاصی کرائی جو مہ پارہ کے سامنے بیٹھی اس کے لیے سیب چھیل رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی جلی کٹی سن رہی تھی۔ فوراً" شکر کا کلمہ پڑھتی اٹھی۔

"جی بی بی جی..."

"مان گیا وہ جانے کے لیے؟" مہ پارہ نے دانتوں سے سیب کترتے اور آنکھوں سے نائلہ کو چٹکی لیتے پوچھا۔

"میں نے ہانی سے کہا تھا کہ اسے سمجھائے... مان گیا۔" ام ہانی کا نام کیا تھا' گویا تتیا مرچ تھی جو مہ پارہ کے حلق تک میں لگ کے سی سی کرا گئی۔

"ام ہانی نہ ہوئی۔ گیدڑ سنگھی ہوگئی جو سعد کو سو سمجھائی اور ہر بات منوالی۔"

وہ کلس کے بولی تھی اور نائلہ نے حسب عادت رسان سے اس کے اعتراض کو ٹالنا چاہا۔

"اس کی مان جو لیتا ہے وہ۔"

"بھابھی... آپ کے دل کو کچھ ہوتا نہیں ہے؟ اولاد وہ آپ کی ہے اور مانتا وہ ہر بات اس کی ہے۔"

"کہا ہوا مان جاتا ہے یہی کافی ہے۔"

"آپ بہت بھولی ہیں بھابھی..." ام ہانی نے اسے ڈھال بنا رکھا ہے... وہ نہ صرف اس سے آپ کی باتیں منواتی ہے بلکہ اپنی بھی ہر بات اسی کے ذریعے آپ لوگوں سے منوالیتی ہے۔"

"نہیں مہ پارہ... ام ہانی کبھی کچھ منوانا تو دور کی بات مانگتی تک نہیں۔ میری تو حسرت ہی ہے کہ وہ کبھی مجھے ماں سمجھ کے کوئی فرمائش کرے۔"

"لو... یاد نہیں؟ لاہور جا کے داخلہ لینے کے لیے اس نے بیسے سعد کو ڈھال بنایا تھا... وہ اتنا بڑا سا لڑکا ڈٹ کے کھڑا ہوگیا تھا اس کے لیے۔"

مہ پارہ تکی بیٹھی تھی' آج نائلہ کو ام ہانی کے سب کردہ ناکردہ گناہ یاد دلانے کے لیے مگر نائلہ نے بھی شاید صبر گھول کے پی رکھا تھا جو مہ پارہ کا ایک ایک وار اٹھا جا رہا تھا۔

"تو کون سا اس کی یا سعد کی مان لی گئی تھی... کب جانے دیا اسے دادا جی نے اور تمہارے بھائی صاحب نے۔"

"ٹھیک ہی تو کیا... میں تو خود اس حق میں نہیں تھی کہ وہ دوسرے شہر جا کے پڑھتی وہ بھی لڑکوں کے ساتھ بھی پرائی بیٹی کی ذمے داری بہت بھاری ہوتی ہے اور پھر اس کی ماں... کچھ ڈھکا چھپا ہوا تو ہے نہیں کسی سے؟"

"مہ پارہ..." اب نائلہ اپنی ناگواری چھپا نہ سکی۔

"جو دنیا میں نہیں... اس کا ذکر کیا تو اچھے لفظوں میں کرو... یا نہ کرو۔"

"اب جو سچ ہے وہ سچ ہے بھابھی... دنیا سے لوگ جاتے ہیں... ان کے کارنامے نہیں... وہ تو پیچھے ہی رہ جاتے ہیں۔ ہمارے بھائی سے اس کی ماں کی دوستی یونیورسٹی میں ہی تو ہوئی تھی اور وہ سارے خاندان سے ٹکر لے کر اس سے کورٹ میرج کر کے الگ ہوگیا تھا۔ ایسی ماں کا کچھ اثر تو آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اس پہ بہت کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ذرا سی ڈھیل اس لڑکی کو..."

بات کرتے کرتے مہ پارہ کی نظر سامنے پڑی تو وہ منہ بنا کے چپ ہو رہی... باہر سے آتی ام ہانی اس کی بات سن کے دہلیز پر ہی جمی رہ گئی تھی... مہ پارہ تو سر جھٹک کے پھر سے سیب کترنے میں مشغول ہوگئی اور نائلہ کچھ نہ کرتے ہوئے شرمندہ ہوگئی ام ہانی کے سامنے۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی ام ہانی... ذرا

"میرے ساتھ سعد کی پیکنگ تو کروانا۔"

"جی تائی اماں۔"

بجھے بجھے انداز میں کہتی ست قدموں سے وہ تائمہ کے پیچھے چل دی۔

ہمیشہ کی طرح مہ پارہ کی باتوں کو جلد ہی ذہن سے اتار کے وہ پھر سے مسکراتے ہوئے مگن انداز میں کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی میں بیڈ پہ کہنی کے بل بیٹھا اسے تکے جا رہا تھا۔

"کچھ رہ گیا ہے تو بتا دو۔" ایک سوٹ کیس بند کرنے کے بعد اس نے بیگ کھولا۔

"ہاں... وہ تو یہیں رہ جائے گا۔"

"ہاں تو بتا دو ناں... کونسی ضروری چیز ہے؟ پیک کر دوں۔"

"بتا تو دوں... مگر تم پوری نہیں آؤ گی اس میں۔"

میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹ نہ پا رہی تھیں۔

"بدتمیز۔" اس کی کھلکھلاہٹ میرے سوٹ کیس اور بیگ میں بھر گئی۔

"چلو اب سو جاؤ۔ صبح جلدی نکلنا ہے تمہیں۔"

وہ بیگ بیڈ کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میں کچھ دیر بند پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر اچھل کے بیڈ سے نیچے اترا اور الماری کھول کے اپنے شب خوابی کے لباس کے نیچے چھپا کے رکھا وہ چھوٹا سا چکنا سا سرمئی پتھر نکالا جس پہ ام ہانی کے ان گنت لمس قید تھے اسے ہتھیلی پہ رکھتے ہی میرے ہونٹوں سے مسکراہٹیں پھوٹنے لگیں۔ یہ وہ پتھر تھا... جو کل کھیل کے دوران میں نے غائب کیا تھا جب ام ہانی کمر پہ دوپٹا کسے اپنے پسندیدہ کھیل اسٹاپو کے لیے خواب گھر کے کچے آنگن کوئلے سے لکیریں کھینچ رہی تھی... پھر اس نے پتھر کو حسب عادت چوم کر نشانہ تاک کر پھینکا... اور ایک ایک خانے پہ پیر جماتی... کودتی آگے بڑھی اور جیسے ہی اس کی نظر چوکی... میں پتھر اٹھا کے بھاگ نکلا... وہ پلٹی تو مجھے سرپٹ بھاگتے دیکھ کے چلائی تھی۔

"سعد... رکو کہاں جا رہے ہو کھیلنا نہیں تھا تو بتا دیتے سعد۔"

مگر مجھے جو چاہیے تھا۔ وہ میں لے اڑا اس چکنے سرمئی پتھر کو میں نے سوٹ کیس میں سب سے نچلی تہہ میں چھپا دیا۔

☆ ☆ ☆

بڑے دادا کا کمرہ۔

نواڑی رنگلا پلنگ۔ تپائی پہ رکھی رنگ برنگی دوائیں، صراحی اور پیتل کا گلاس۔ پلنگ کے ساتھ نیچے رکھا اگالدان۔

پائنتی رکھی بروکیڈ کی رضائی۔ عقب پہ ٹنگی بندوق....

اور بڑے دادا کی وہی آہیں... وہی کھانسی وہی سرد آہیں۔

اور ان آہوں اور کھانسی کے درمیانی وقفے میں بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے ابو...

مجھے اب جمائیاں آنے لگیں... کب سے ابو انہیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"صبح سعد کو..." اور کھانسی کا دورہ...

"آپ سوئے ہوں گے اس وقت تو میں نے سوچا ابھی..." رضوان نے دوبارہ کہنے کی کوشش کی۔ مگر ...

اس بار ذرا زیادہ طویل ہو گیا کھانسی کا دورانیہ... اور میری جمائیاں بھی... ذرا تھمیں تو وہ آہیں بھرنے لگے جو قدرے غنیمت تھیں۔

"بس اب ابھی اسے دعا دے کر رخصت..." اب کے جو دورہ پڑا تو میری جمائیوں نے ہی ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لی... میں ابو کی بات مکمل ہونے کی امید چھوڑ کے اب بڑے دادا کی دواؤں کے لیبل پڑھنے لگا۔

"نہ بھیج اسے لہور۔" ابو کی بات تو کیا پوری ہوتی تھی۔ بڑے دادا نے اپنی شروع کر دی۔

"لہور جا کے منڈے خراب ہو جاتے ہیں سلمان کا حال یاد نہیں؟ وہ تو پھر بھلے وقت تھے... اب تو ماحول اور خراب ہو گیا ہے۔ لہور بھیجنے سے اچھا ہے اسے ولایت بھیج دے۔"

ان کے مشورے پہ ابو مسکرا دیے۔
"تو بیا ولایت جا کے لڑکے خراب نہیں ہو سکتے دادا جی؟"
"نہ او تھے کی خراب ہونا۔ زیادہ سے زیادہ میم لے آئے گا۔ چنگا لے آوے۔ بچے سوہنے ہوں گے۔ نیلی آنکھوں سنہرے بالوں والے۔ مگر لوہر نہ بابا۔ توبہ توبہ۔"
پھر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سرہانے رکھی چھڑی اٹھا کے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے متوجہ کیا۔
"اوئے۔"
"جی بڑے دادا۔"
میں نے پسلی سہلائی۔ بڑے زور کی چبھی تھی چھڑی۔
"کل سن۔ خبردار جو تو نے وڈے بازار کا رخ کیا تو۔ میں ٹانگیں چیر دوں گا تیری۔"
"ہیں؟ وڈا بازار؟" میں ہونق سا ان کے دونوں کو تکنے لگا۔ ابو خاصے جز بز لگ رہے تھے۔
"دادا جی! آپ بھی کیا۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا۔"
"کیوں؟ یہ چھوٹا کاکا ہے؟ تجھے کیا پتا نئی نسل کا کتنی کھوچل اور میسنی ہے اندرو اندری۔ سعد جیسے مجھے پتہ چلا کہ تو وڈے بازار جانے لگا ہے تو تیری خیر نہیں۔"
انہیں دوبارہ کھانسی کا دورہ پڑا اور ابو نے آنکھ سے مجھے کھسکنے کا اشارہ کیا۔
"ابو۔ یہ وڈا بازار کونسا ہوتا ہے؟"
نکلتے نکلتے میں نے سرگوشی میں پوچھا تو جواب میں انہوں نے تگڑی سی گھوری ڈالی۔

※ ※ ※

علی الصباح نکلنا تھا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کہاں ہوگی اس لیے بیگ اٹھائے سیدھا برآمدے میں آیا جہاں وہ جائے نماز بچھائے فجر کی نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی۔ میں دو قدم دور کھڑا چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کتنا اچھا لگتا تھا نا مجھے اسے یوں دیکھتے چپ جانا۔ دعا مانگنے کے بعد اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ گیا۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔
"ہنی... میں جن..."
اس نے گھور کے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو میں پھر سے اپنے دل پسند شغل سے خود کو بہلانے لگا۔
اس کے دھلے دھلے چہرے پہ بند پلکوں کا ہلکا سا ارتعاش... ورد کرتے لب۔ پھر اس نے میرا چہرہ ہاتھ سے پکڑ کر اپنے نزدیک کیا اور میرے دائیں کان میں پھونکتے ہوئے کہا۔
"فی امان اللہ..."
"مجھے روک لو ہنی..."
اور یہ تو میں پچھلے تین دنوں میں اسے کتنی بار کہہ چکا تھا۔
"فضول باتیں... پڑھنے کی چوری کرو گے تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔"
وہ دوپٹے کے پلو کی گرہ کھولتے ہوئے کچھ نکال رہی تھی۔
"آدھی جان تو میری جانے کے خیال سے نکل رہی ہے باقی آدھی تم ناراضی کی دھمکی دے کر نکال دو۔"
اس نے کپڑے کی ایک دھجی میرے دائیں بازو پہ باندھنی چاہی۔
"اب یہ کیا ہے؟"
"امام ضامن۔"
اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو صرف لہجہ نہیں تھا جو بھیگ رہا تھا آنکھوں کے گوشے بھی تھے۔ میں نے انگلی کی پور پہ اس کی پلک پہ لٹکا آنسو چن لیا۔
"اسے بھی باندھ دو ساتھ... کیا کرو گی چھپا چھپا کے۔" وہ مسکرا دی۔
"بدھو۔"
"سعد..."
مہ پارہ پھوپھو کی پاٹ دار آواز گونجی۔

"جاؤ ناں... دیر نہ ہو جائے۔" اس نے کاندھے سے پکڑ کے میرا رخ موڑا۔

"سب وہاں تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔"

میں نے آنکھوں میں اس کا چہرہ بھرنا چاہا مگر کسی طرح سماتا ہی نہیں تھا۔ آنکھیں نم سب چھوٹا پڑ جاتا تھا۔ جانتا تھا مجھے رخصت کرنے وہ کبھی بھی باہر تک نہیں آئے گی۔ اس لیے میں نے کہا بھی نہیں اور جتنے نقوش میری دو آنکھوں میں سما سکتے تھے' ان کو ہی سمیٹ کر چل دیا جہاں مسلسل ہارن پہ ہارن بج رہے تھے۔

"ابھی جاؤ سعد... تمہارے ابو کا ہاتھ نہیں ہٹنے والا ہارن سے۔" یہ امی تھیں جو پتا نہیں کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھیں۔

"میرا شونا مونا جا رہا ہے؟"

اور یہ مہ پارہ پھوپھو تھیں جو میرے دونوں گال نوچتے ہوئے لاڈ جتا رہی تھیں۔ وہ لاڈ جو سال میں ایک آدھ بار آتا۔

میں نے ان سے اپنے گال چھڑاتے ہوئے اور کار میں بیٹھتے ہوئے ایک نظر مڑ کے پیچھے ڈالی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ مگر جالی کے پردے کے پیچھے اس کا ہیولہ نظر آ رہا تھا۔ جو فوراً" ہی ہٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی اوپر سے کھڑکی کے پاس سے ہٹی... آنسوؤں کو اب کسی کا پردہ نہیں تھا۔ وہ دیوار پہ لگی اپنی اور سعد کی ان گنت تصویریں دیکھنے لگی۔ ہنستی مسکراتی تصویریں... زندہ جاگتی تصویریں۔

"ساری زندگی کوئی دوست نہیں بنا میرا... تم بھی نہ بنتے... کم از کم ایک اور اداسی تو میرے حصے نہ آتی۔"

"ہانی بی بی۔" سلمیٰ نے جھانک کر پکارا۔

"بی بی جی کہہ رہی ہیں آپ کی خالہ کا فون ہے۔ آکے سن لیں۔"

"خالہ؟" وہ چونکی۔

"ہاں جی... ولایت والی خالہ... وہ جو عید کے عید فون کرتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

ہاسٹل کی بلڈنگ کو دیکھتے ہی میرا دل ہولنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سنٹرل جیل کے سامنے کھڑا ہوں۔ ابو بڑے اطمینان سے ڈرائیور کو سامان اندر رکھوانے کا کہہ رہے تھے۔ پھر مجھے ڈپٹنے لگے۔

"اب بس بھی کرو سعد... مرد بنو یہ تمہارا پہلا قدم ہے گھر سے باہر ابھی تمہیں بہت آگے بڑھنا ہے۔"

میں برے برے منہ بناتا سر ہلا رہا تھا۔

"میں ہر ویک اینڈ پہ ڈرائیور کو بھیج دیا کروں گا۔"

"شکریہ اس عنایت کا۔"

"اور ہاں... سنو۔"

میرے جلے کٹے لہجے پہ بھی انہوں نے مزید ڈانٹنے سے پرہیز کیا اور کچھ ہچکچاتے ہوئے کہنے لگے۔

"وہ... دراصل... دادا جی کی بات نے میرے دل میں بھی وہم سا بیٹھا دیا ہے۔ دوستوں کے معاملے میں احتیاط کرنا۔ نہ تو ہر کسی سے یاریاں گانٹھنا... نہ ہر جگہ منہ اٹھا کے چلے جانا خاص طور پہ وہاں تو بالکل بھی نہیں۔"

"وہاں کہاں؟"

"وہیں... جہاں کا دادا جی نے بھی منع کیا تھا۔"

"اوہ... اچھا وہ وڈا بازار..." مگر میرا اس جگہ کا نام لینے سے ہی ابو کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اوں ہوں۔ بالکل بھی نہیں ہرگز نہیں سمجھے۔"

کچھ نہ سمجھنے کے باوجود میں نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"دھیان سے سلمیٰ یہ آلو کے چھلکے اتار رہی ہو یا تربوز کے اتنے موٹے؟ جلدی کس بات کی ہے؟ ایسے ہبڑ دبڑ لگائی ہوئی ہے؟ نہیں جانا ہے تجھے؟" نائلہ کی جھڑکیاں سن کے سلمیٰ کا تو جیسے دل کا چور پکڑا گیا۔

"نہیں بی بی جی۔ توبہ۔ میں نے بھلا اتنے شام ڈھلے کہاں جانا ہے۔"

اور پھر مہ پارہ کو آتے دیکھ کے سلمیٰ کا رنگ اور فق ہو گیا۔ نائلہ تو ایک آدھ سوال کے بعد جان چھوڑ دیتیں۔ انہوں نے بھلا کہاں جان خلاصی کرنا تھی۔ مگر مہ پارہ کے اندر تو انگ ہی کھد بد لگی تھی سویرے سے۔ سلمیٰ پہ دھیان کہاں دیتیں۔

"خیر تو ہے بھابھی۔ یہ ام ہانی کی خالہ کہاں سے زندہ ہو گئی۔"

"یوں کہو۔ کہ بھانجی کی محبت زندہ ہو گئی۔"

"ہاں جی۔ عید سے پہلے ہی فون کر دیا انہوں نے اس بار۔" سلمیٰ کے بولنے کی دیر تھی کہ نائلہ نے پہلے تو اسے باہر چلتا کیا۔

"ہر بات میں ناک گھسیڑتی ہے۔ جاؤ جا کے دادا جی سے پوچھو۔ رات کے کھانے میں دلیا لیں گے یا کھچڑی؟"

اس کے جانے کے بعد نائلہ نے پانی پیتی مہ پارہ کو بڑی رازداری سے بتایا۔

"غنیمت ہے۔ خیال تو آیا خالہ کو بھانجی کا اور وہ بھی نیک نیتی سے۔ اس کا چھوٹا بیٹا جو ڈاکٹری کر رہا ہے اس کے لیے؟" اور مہ پارہ کو یہ سنتے ہی اچھو لگ گیا۔

☆ ☆ ☆

کروٹیں لے لے کر میں تھک گیا تھا۔ ایک عجیب سی بے کلی تھی۔ دل کا کوئی کونہ خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا۔ شعیب۔ میرا روم میٹ۔ گجراتیا۔ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا کتاب سے بار بار نظر ہٹا کے مجھے دیکھتا۔ اور میں مزید چڑ جاتا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔

"کیا بات ہے؟ نیند نہیں آ رہی؟"

دل تو چاہا۔ کہوں "تمہیں کیا؟ تم کتاب میں منہ دو۔" مگر بے بسی سے انکار میں سر ہلا کے رہ گیا۔

"پہلی بار گھر سے دور ہوئے ہو؟"

"ہاں پہلی بار۔ پہلی بار دور ہوا ہوں اور احساس ہو رہا ہے کہ دور ہونا کسے کہتے ہیں۔"

"عادی ہو جاؤ گے میں تو بچپن سے ہاسٹل میں رہتا ہوں۔ آرمی آفیسر کا بیٹا جو ہوا۔ چلو تمہیں بہلانے کے لیے کہیں گھما لاتا ہوں۔ کہاں چلو گے؟" وہ کتاب بند کرتے ہوا اٹھا اور مجھے اچانک یاد آیا۔

"سنو۔ یہ وڈا بازار کہاں ہے لاہور میں؟"

"واٹ۔" وہ پہلے چونکا پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"کیوں؟ دادا جی کو کیوں اعتراض ہو گا؟" نائلہ حیرت سے بولیں۔

"تمہیں ان کے خیالات کا اندازہ تو ہے۔ سلمان کی سالی کا بیٹا ہمارے لیے غیر ہے اس کی بیوی کو ہی تو ساری زندگی بہو کے طور پہ قبول نہیں کیا انہوں نے۔ کہ غیر برادری کی ہے۔" رضوان کے کہنے پہ وہ جھنجلا اٹھی۔

"اور وہ جو ولایت سے میم لانے کے لیے کہہ رہے تھے سعد کو۔ وہاں کون سی برادری بیٹھی ہے ہماری۔"

"یونہی کہا ہو گا اور یوں بھی گزرے سالوں نے اتنا تو فرق ڈالا ہے اب خاندان میں کئی بہوئیں باہر سے آئی ہیں۔ مگر بیٹی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ایسا ابھی تک نہیں ہوا۔"

"آخر پہلی بہو بھی تو کوئی لایا ہو گا۔ کسی کو تو اس معاملے میں بھی پہل کرنی ہے۔ اب کل پرسوں تک وہ لڑکا آ رہا ہے۔ مل تو لیں۔"

"نائلہ۔ ایک غیر جوان لڑکا۔ وہ بھی لندن پلٹ۔ ہمارے گھر آ کے رہے۔ وہ بھی کچھ دن کے لیے ہماری بچی کو جانچنے پرکھنے۔ وہ بالکل پسند نہیں کریں گے۔"

"ایک تو دادا جی نے حویلی پہ 1925ء کا آئین نافذ کر رکھا ہے۔ اب کون سا زمانہ رہا ہے ایسی باتوں کا۔ ہمارے لیے غیر سہی۔ ام ہانی کا تو سگا خالہ زاد ہے اور وہ اسے ہانی کو جانچنے پرکھنے کے لیے نہیں بھیج رہیں۔ ہمیں کہا ہے کہ ہم لڑکے کو دیکھ بھال لیں تو وہ اگلے

مہینے آکے باقاعدہ رسم کریں۔"

"اور وہ جو تین چار دن رہنے کے بعد ام ہانی کو ناپسند کرکے چلا گیا تو؟" رضوان نے خدشے کا اظہار کیا۔

"کمی کیا ہے ام ہانی میں اور ماں نے بیٹے کو کچھ سمجھا کے ہی بھیجا ہوگا۔ ولایتی لوگ ہیں۔ بنا بیٹے کے رضامندی کے اتنی بڑی بات منہ سے نہیں نکالی ہوگی انہوں نے اور دیکھیں رضوان۔۔۔ رشتے ناتے ایسے ہی طے ہوتے ہیں۔ لڑکی بیاہنی ہے کہ نہیں؟ یا بس کی طرح اسے بھی حویلی میں سجا کے رکھنا ہے۔"

"ایک تو تمہیں ہر موقعے پہ میری بہن چبھنے لگتی ہے۔" رضوان نے پہلے ہی حفاظتی بند باندھ دیا۔ پتا تھا کہ مہ پارہ کی بات نکلی ہے تو دور تک جا پہنچے گی۔

"اللہ کے فضل سے ہے ہی ایسی نوکیلی۔۔۔ چبھ، چبھ جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے آنے دو لڑکے کو آگے جو ام ہانی کا نصیب وہ اتنی اچھی ہے اس کے ساتھ اچھا ہی ہونا چاہیے۔ سو اداجی کو بھی سمجھا دیں گے۔"

☼ ☼ ☼

شعیب اپنے تئیں بڑا مجھے بہلانے نکلا تھا۔ لاہور کی رونقیں، روشنیاں، گہما گہمی ان سب نے میری وحشت میں مزید اضافہ ہی کیا تھا۔ بہت ہی برے موڈ میں واپس آتے ہی میں نے اسے کال کی اور لڑنے لگا۔

"تم بہت بری ہو۔ بالکل بھی اچھی نہیں ہو۔۔۔ تم مجھ سے ملنے بھی نہیں جاتے ہوئے۔"

"تم حرکتیں بھی تو بچوں والی کرتے ہو۔۔۔ اگر مجھ سے ملتے ہوئے رونے لگ جاتے تو سب کتنا مذاق بناتے تمہارا۔" اس کے بہانے کو میں خاطر نہ لایا۔

"جھوٹ، تمہیں ڈر تھا کہ تم خود رونے نہ لگ جاؤ۔" سچی بات سن کے اس نے بات ہی بدل دی۔

"اچھا تو تم نے لڑنے کے لیے فون کیا ہے؟"

"نہیں تمہاری آواز سننے کے لیے، پتا ہے ابھی تمہاری آواز سن کے کیسا لگا؟"

"کیسا لگا؟"

میں چپ ہو گیا جو محسوس ہوا تھا اس کی آواز سن کے وہ شاید لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی کچھ تو کہنا تھا۔

"اس وقت تمہاری آواز سننا ایسا ہے ہنی۔۔۔ جیسے گرمیوں کے روزے میں مغرب کی آواز سننا۔"

"آ رہی ہوں تائی اماں۔"

اس کی بلند پکار میں میری آدھی بات دب ہی گئی۔ نجانے باقی کی آدھی بھی اس نے سنی تھی یا نہیں۔

"میں بعد میں بات کرتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

تھا تو رات کا پہلا پہر مگر سکوت آخری پہر والا چھایا تھا۔ ایک تو اماوس، اوپر سے جاتا جاڑا اور پھر شام سے ہونے والی بوندا باندی سب لحافوں میں دبکے پڑے تھے ایسے میں سلمیٰ کے پیروں کی پازیب خوب ہی راز کھول رہی تھی۔

تائی اماں کی بات سن کے اپنے کمرے کے لیے جاتی ام ہانی نے اس پازیب کی چھنک کو خوب پہچان لیا اور فوراً ہی پچھلے والان کی جانب کھلنے والے دروازے کی جانب آ کے اسے آن لیا۔

سلمیٰ گلابی کروشیے سے بھری سیاہ چادر میں سمٹ کے رہ گئی۔ اسے اس وقت ام ہانی کی گھورتی نظریں مہ پارہ کی نظروں سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔

"سلمیٰ تم اتنی رات کو باغیچے میں کیا کر رہی تھی؟"

"وہ میں۔۔۔ میں ہانی بی بی۔"

"پچھواڑے سے آ رہی ہو؟"

ام ہانی کی نظریں ساتھ ساتھ ادھر ادھر کسی اور کے وجود کو بھی تلاش کر رہی تھیں۔ مگر دور تک صرف پیڑوں کے سیاہ ہیولے نظر آ رہے تھے۔

"میں تو۔"

"جھوٹ مت بولو میں نے خود دیکھا ہے۔"

ام ہانی نے ڈپٹ کر کہا تو سلمیٰ بالکل ہی ڈھے گئی۔ اور لگی واسطے دینے۔

"بی بی جی کو نہ بتانا ہانی بی بی۔۔۔ اللہ پاک کا واسطہ ہے

...پنجتن کا واسطہ۔"

"میں تو نہیں بتا رہی مگر یہ کم بخت تمہاری پازیبیں ضرور بتا دیں گی کسی دن' ان کو اتار کے دفعان ہوا کرتا ہے۔"

ذرا سی چھوٹ کیا ملی کہ سلمیٰ چادر کا کونہ دانتوں میں دبا کر شرمانے لگی۔

"اس کو پسند ہے جی اور اسی کا تحفہ ہے۔ اسے پہنتی ہوں تو جی اٹھتی ہوں۔"

"بست جی لیا... اب یہی پازیبیں شور مچا کے تجھے مروائیں گی۔"

☼ ☼ ☼

"بے کار رہا... تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تمہارا دل نہیں لگ سکتا یہاں۔"

شعیب مجھے بے زار سا بیڈ پہ پڑا دیکھ کے افسوس سے سرہلا رہا تھا۔

"بلکہ میں تو کہتا ہوں۔ یہاں کیا... کہیں بھی نہیں لگے گا... کیونکہ..."

وہ ذرا سا رکا... پھر کھوجتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کیونکہ دل تم کہیں اور لگا بیٹھے ہو۔"

کسلمندی سے لیٹے میں نے ایک دم آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ وہ اپنے اندازے کی درستگی پر مسکرا رہا تھا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

میری ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے سوال کا جواب دیا وہ مزید بے تکلفی دکھاتا برابر پھیل کے لیٹ گیا۔

"کچھ بتاؤ گے نہیں؟"

"اوں ہوں... پہلے اسے تو بتا دوں۔"

☼ ☼ ☼

ناشتے کی میز پہ آلو کی بھجیا اور مٹر والے پراٹھے رکھتے ہوئے نائلہ کو سعد کی یاد پہلے سے کچھ بڑھ کے آئی۔

"آج تیسرا دن ہے سعد کو گئے۔"

"تین دن اور صبر کے ساتھ گزار لو... ویک اینڈ پہ بلوا لیتا ہوں۔" رضوان نے تسلی دی۔

"وہ جی مہمان آ گئے ہیں ولایت والے۔"

سلمیٰ کے آ کے اطلاع دینے پہ رضوان پہلا نوالہ توڑتے توڑتے رکے اور جلدی سے اٹھے۔

"اوہو... نائلہ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا' ہمیں ڈرائیور بھیجنا چاہیے تھا ایئرپورٹ۔"

"کچھ زیادہ جلدی نہیں دکھائی ام ہانی کی خالہ نے؟"

مہ پارہ انڈوں کا حلوہ کھاتے ہوئے بھی حلق کی تلخی کو محسوس کر رہی تھیں۔

"بیٹی کا معاملہ ہے۔ جتنی جلدی فرض ادا ہو جائے اتنا اچھا۔"

نائلہ نے رضوان کے پیچھے پیچھے جاتے جاتے کہا ...اور جلتی بھنتی مہ پارہ نے ہاتھ کا چمچہ پیالی میں واپس پٹخا۔

"ہاں اب سب کو جلدیاں سوجھ رہی ہیں میرے تو سر کے بال بھی پکا ڈالے بٹھا بٹھا کے۔" اور وہ اپنا موڈ تب بھی ٹھیک نہ رکھ سکی جب جنید بڑے مودب انداز میں سب کے درمیان بیٹھا ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں مسلسل کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"تمہارے گھر میں سب خیریت ہے بیٹا۔" نائلہ کے پوچھنے کے دوران مہ پارہ مسلسل جنید کی نظروں کی بے چینی نوٹ کر رہی تھی۔

"جی سب ٹھیک ہیں' ماما نے سلام بھجوایا ہے۔"

"وعلیکم اسلام... سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" رضوان کے سوال کے جواب میں بھی وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"جی نہیں آرام سے کٹ گیا۔"

"کسے ڈھونڈ رہے ہو؟" آخر مہ پارہ سے رہا نہ گیا۔

"جی نہیں کسی کو بھی نہیں۔" بے چارہ بوکھلا کے رہ گیا۔

"آپ کی حویلی بہت خوب صورت ہے۔"

"ام ہانی اسکول سے بس آتی ہی ہو گی۔" نائلہ نے

مسکرا کے وہ جواب دے رہا تھا۔ جس کا سوال وہ کرنے پا رہا تھا۔

"اسکول؟" جنید کے استفسار پہ رضوان نے وضاحت کی۔

"سلمان کی وفات کے بعد میں نے اس کے نام سے قصبے میں ایک ٹرسٹ اسکول اور ایک چھوٹا سا ہاسپٹل بنوایا تھا۔ اپنی ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد ام ہانی ہی اس اسکول کو دیکھ رہی ہے۔"

"اوہ... thats great۔"

اسی وقت ام ہانی اندر داخل ہوئی... اور ٹھٹکتے سنبھلتے سلام کیا۔

"السلام علیکم۔"

مہ پارہ نے جنید کے چہرے پہ وہ پسندیدگی دیکھ لی۔ جو ام ہانی کی پہلی جھلک کے بعد ہی نمایاں ہو گئی تھی۔ ان کی بے آرامی اور بڑھ گئی۔ وہ پہلو بدلنے لگی۔

"اوہ... کیسے ہیں آپ؟ خالہ کیسی ہیں وہ کیوں نہیں آئیں؟ انہیں بھی ساتھ لے آتے۔"

اس کا جواب جنید کی بجائے نائلہ نے بڑی ہی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔

"آجائیں گی... وہ بھی آجائیں گی... بہت جلدی ان شاء اللہ۔"

☼ ☼ ☼

اور میرے دل کا ایک نہیں جیسے ہر کونا خالی ہو رہا تھا۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ جو نقش میں آنکھوں میں سمو کے لایا تھا۔ پتا نہیں وہ دھندلے کیوں پڑ رہے تھے کیا آنکھوں کی نمی اتنی بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اندازہ نہیں تھا یہ جگہ اتنی خوب صورت ہو گی۔" جنید نے جھروکے سے جھانکتے ہوئے دور تک پھیلے سبزے کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ پہلے کبھی پاکستان نہیں آئے؟"

"آیا تھا۔ دوبار... مگر ایک تو اس جگہ کبھی نہیں آیا' صرف لاہور اور کراچی گیا... دوسرا بہت پرانی بات ہے آخری بار جب آیا تو کوئی بارہ تیرہ سال کا تھا۔"

"کب کی بات ہے یہ؟" وہ یونہی پوچھ رہی تھی... بات برائے بات مگر وہ مسکرا اٹھا۔

"آپ میری Age جاننا چاہ رہی ہیں تو ڈائریکٹ پوچھ لیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ شرمندہ ہو اٹھی... بلاوجہ ہی۔ "میں آپ کی Age جان کے کیا کروں گی؟"

"جاننی چاہیے آپ کو میرے بارے میں سب کچھ جاننا چاہیے... اسی لیے تو آیا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ جنید کی اس بات پہ کچھ غور کرتی اندر سے آتی فون کی مسلسل آواز نے اسے پلٹنے پہ مجبور کیا۔

"ایکسکیوزمی... میں ذرا فون سن لوں۔" جنید بھی اس کے پیچھے پیچھے ہال تک آگیا۔

"ہیلو۔"

وہ دوسری جانب میں تھا جو بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔

"کہاں تھیں تم؟ اتنی دیر سے فون اٹھایا؟"

"پہلے تم بتاؤ... تم کہاں ہو یہ ٹائم تو تمہاری کلاس کا ہے۔" ام ہانی نے رعب جھاڑنا چاہا... جسے میں ذرا خاطر میں نہ لایا۔

"ہاں... لیکچر درمیان میں چھوڑ کے آیا ہوں۔ اب تم نہ شروع کر دینا اپنا لیکچر میں تمہیں مس کر رہا ہوں بہت۔"

"نہ پڑھنے کے بہانے۔" ام ہانی نے ہنسی روکی۔

"تم نے مجھے یاد کیا؟" میں بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں... دو تین دن تو کافی۔"

"اور اس کے بعد؟ کافی سے بھی بہت زیادہ؟" میرے لہجے کی امید اور بڑھی۔

"نہیں... پھر ٹائم ہی نہیں ملا... آج صبح جنید آ گئے۔ ان کو کمپنی دے رہی ہوں۔ کل انہیں فارم ہاؤس اور اپنا اسکول بھی دکھانا ہے۔"

"کون جنید؟" میں چونکا۔

"کزن ہیں میرے۔"

"وہ تو میں ہوں۔" میں باقاعدہ برا مان گیا۔

"بدھو۔۔ تم اکیلے تھوڑا ہی ہو۔۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔" اس بات پہ تو جیسے میرا فیوز ہی اڑ گیا۔ میں نے کال فورا" کٹ دی۔

"ارے۔۔ سعد ہیلو۔"

اور ریسیور رکھتی مڑی جنید صوفے پہ بیٹھا کسی میگزین کے ورق الٹ رہا تھا۔

"سوری۔۔ سعد کی کال تھی۔۔ کزن ہے میرا۔"

"وہ تو میں ہوں۔" جنید نے میگزین رکھتے ہوئے اسے مسکرا کے دیکھا۔

"آپ اکیلے تھوڑا ہی ہیں اور پھر آپ تو صرف کزن ہیں۔۔ وہ تو اور بھی بہت کچھ ہے میرا سب سے اچھا دوست میرے بچپن کا ساتھی۔۔ میرے ہر دکھ سکھ کا شریک۔"

"وہ تو میں بھی ہو سکتا ہوں۔"

ام ہانی دوسری بار اس کی بات پر ٹھٹکی۔۔ اور ابھی پھر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"نہیں، جو سعد ہے وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا اس کی جگہ کوئی اور لے ہی نہیں سکتا۔"

فون بند کرنے کے بعد ہی میں سن سا بیٹھا رہا جیسے دماغ میں جھکڑ چل رہے ہوں۔

"بدھو۔۔ تم اکیلے تھوڑا ہی ہو۔" میرے ہاتھوں پیروں میں جان ہی نہ رہی۔

"کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔" ام ہانی کی اتراتی آواز نے ان بے جان ہاتھ پیروں میں جیسے روح پھونک ڈالی۔۔۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں کوئی اور نہیں ہو سکتا کوئی اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔"

"اور اگلے ہی پل میں بھاگتا ہوا کالج کے گیٹ سے روڈ پہ تھا۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی جنید کو قصبے کی سیر کرانے لے جا رہی تھی۔

"پتا نہیں آپ کو یہ جگہ پسند بھی آئی ہے یا نہیں۔"

"ابھی تک تو جو دیکھا ہے۔۔ وہ بہت پسند آیا ہے۔۔۔ دل سے۔"

جنید کے الفاظ۔۔ اس کا لہجہ ہر بار ام ہانی کو الجھا سا جاتا تھا۔ وہ ایک بار پھر الجھن بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی مگر جنید کے چہرے پہ ایک سادہ مہان سی مسکراہٹ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

"میرا مطلب ہے یہ حویلی بہت شاندار ہے۔"

دونوں کے قدم بڑے سے لکڑی کے پھاٹک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جنید مڑ مڑ کے پیچھے دیکھ رہا تھا پھر پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

"وہ کیلے کے جھنڈ کے پیچھے جو کھنڈر نما عمارت نظر آرہی ہے کیا وہ بھی حویلی کا ہی حصہ ہے؟"

"جی کہہ سکتے ہیں۔" وہ بھی چلتے چلتے رکی۔

"مگر اب استعمال میں نہیں ہے۔ تقریبا" پچاس ساٹھ سال سے۔" "واؤ۔۔۔ پھر تو میں اسے ضرور دیکھنا چاہوں گا۔" جنید کی فرمائش پہ وہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"اسے دیکھ کے آپ کیا کریں گے۔ چند بوسیدہ دیواریں، گرتی چھتیں اور خود رو گھاس میں جنگلی پودے۔"

"یہ بتا کے تو آپ نے میرا شوق اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ارے کہیں آپ اس پرانی جگہ پہ جاتے ہوئے ڈرتی تو نہیں رہیں۔"

"جی نہیں۔۔ میرا تو بچپن اور لڑکپن وہیں کھیلتے گزرا ہے ڈر کیسا وہ جگہ تو میری سہیلی ہے۔"

"میں آپ کی سہیلی سے ملنا چاہوں گا۔ ابھی۔"

جنید اسی جانب بڑھ گیا تو ام ہانی اسے روکتے روکتے ہچکچا سی گئی اور پھر چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔

کھنڈر ویرانی اور وحشت سے منسوب ہوتا ہے۔۔ مگر یہ خواب نگر عجیب تھا۔ یہاں آتے ہی اندر کی تنہائی دوست بن جاتی تھی اور وحشت نیم خوابیدہ سی ہو جاتی تھی۔۔ جنید نے بھی وہی سکون محسوس کیا وہاں آ کے۔

پیروں تلے آ کے کسمسا کے کراہتے زرد پتے۔۔ بڑے سے برگد کے پیڑ تلے کچی مٹی پہ چاک سے بنے

امہانی کے پسندیدہ کھیل کا خاکہ۔

پیڑ کے دوسری جانب لٹکتا جھولا۔۔۔ جس پہ اب کھمبیاں اگ آئی تھیں۔

آنگن کے وسط میں لال کناروں والا کنواں۔۔۔ جس کا ڈول ہوا کے دوش پہ ہلتا ایک کھنک سی پیدا کر رہا تھا۔ جنید بھی مبہوت سا ہو گیا۔

"بیوٹی فل۔۔۔"

"کچھ اور آگے بڑھ کے راہداری کے اکھڑے فرش پر پیر جماتا جماتا وہ رکا۔۔۔ راہداری کی داہنی دیوار ساری کی ساری مختلف تصویروں سے بھری تھی۔۔۔ کہیں قدرتی مناظر کو ابھارا گیا تھا تو کہیں ناشناسا نقوش والے چہرے۔

"یہ آرٹ ورک؟"

"میرا شوق ہے۔" جنید کے پوچھنے پہ بتاتی بتاتی وہ کچھ شرما گئی۔

"بہت آرٹسٹک مزاج ہے آپ کا۔۔۔"

راہداری پچھلے دالان میں نکلتی تھی وہاں پہنچ کر جنید پھر سے رکا۔۔۔ اسی بار نظروں میں حیرت اور بھی نمایاں تھی۔ دیواروں پہ۔ دروازوں پہ۔۔۔ ستونوں پہ۔۔۔ جا بجا سعد اور امہانی کا نام بمع تاریخ کے لکھا تھا نام وہی تاریخ ہر بار مختلف۔۔۔

"اور۔۔۔ یہ؟ یہ کس کا شوق ہے؟" اب وہ سنجیدہ تھا۔

"یہ سعد کا شوق ہے۔"

☆ ☆ ☆

میں پہلی بار نوکل بس میں بیٹھا تھا اس سے پہلے صرف راستوں میں آتے جاتے پاس سے گزری ان بڑی بڑی رنگین بسوں کے پیچھے لکھے صرف اشعار ہی پڑھے تھے۔ مگر اب میں دوسرے بہت سے مسافروں کے ساتھ ٹھنسا اس میں بجتے اعلا ذوق کے میوزک سے بھی بہلانے کی کوشش کر رہا تھا خود کو۔

ہاں 'بہلانے کی کوشش۔۔۔ دھیان بار بار امہانی کی ان ہی الفاظ میں اٹک جاتا تھا جو نیزے کی طرح کھبے تھے دل میں۔

"تم اکیلے تھوڑا ہی ہو۔۔۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔"

یہ الفاظ۔۔۔ ان کی چبھن۔۔۔ ان کی جلن اس چند گھنٹے کے سفر کو بہت طویل۔۔۔ بہت کٹھن اور بہت تکلیف دہ بنا رہی تھی۔ پہلے میں نے دھیان بٹانے کے لیے ادھر ادھر جائزہ لینا چاہا۔

سامنے والی سیٹ پہ براجمان سرمئی ٹوپی برقعے والی خاتون۔۔۔ جن کی گود میں بڑا سا ٹفن تھا اور ٹفن سے اٹھتی دیسی گھی کی خوشبو' ان کے ساتھ بیٹھی ان کی چودہ پندرہ سال کی بیٹی جس کے نقوش اس کی کم عمری کی چغلی کھا رہے تھے مگر نظروں کی بے باکی۔۔۔ میں نے گھبرا کے نگاہیں دوسری جانب کیں۔

ایک نو بیاہتا دیہاتی جوڑا۔۔۔ مرد نے شاید شادی کے دن سے لے کر آج تک یہ بوسکی کا شلوار قمیص اور واسکٹ تبدیل نہیں کی تھی۔ پسینے کی بدبو کے بھبکے یہاں تک آ رہے تھے مگر اس کی نارنجی جوڑے' نارنجی لپ اسٹک اور گولڈن سینڈل والی بیوی اس سے چپکی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔۔۔ مسکراتے ہوئے اس کے ماس خورے کے شکار مسوڑھے عجیب کراہیت دلا رہے تھے۔ میں نے گھن کھاتے ہوئے رخ ہی بدل لیا۔

وہاں ایک مولوی صاحب ڈکار پہ ڈکار لیے توند کھجا رہے تھے۔۔۔ اور جب ڈکاروں کا سلسلہ تھمتا تو کنڈیکٹر کو یہ بے ہنگم موسیقی بند کرنے کی نصیحت کرتے۔

میں نے آخر اس موسیقی میں ہی پناہ لینی چاہی بصارت کا امتحان بہت لے لیا تھا۔ شاید سماعتیں ہی اس سفر کی دشواریوں کو سہل بنا دیتیں۔

"تیرے جیا مینوں ہور نہ کوئی۔۔۔

ڈھونڈاں جنگل 'بیلہ' روہی۔۔۔

چھٹتی مڑ ویں طبیبا۔۔۔

نئیں تے میں مر گئی آں۔۔۔

مجھے سچ میں سکون سا آنے لگا۔۔۔ آنکھیں موند کے میں کچی پکی سڑک کی وجہ سے ملنے والے ہچکولوں کے مزے لینے لگا۔

سانوں گھائل کرکے خیر خبر نہ لئی آں۔۔۔

چبھتی مژگاں دے طبیبا۔۔۔
نندی تے میں مر گئی آں۔۔۔

اچانک بس ایک جھٹکے سے رکی۔۔۔ میری سماعتیں اب عجیب سے شور سے جھنجلا اٹھیں۔۔۔ کوفت سے آنکھیں کھولیں تو بس ایک ویران' اجاڑ سڑک پہ رکی کھڑی تھی۔

"اوئے استاد جی تیرے سوہرے نیں؟" ایک اکھڑ سے شخص نے کنڈیکٹر سے استفسار کیا۔

"بس خراب ہو گئی ہے جی۔۔۔ ٹیم لگے گا۔"

میری بے چینی' بے کلی پھر سے عود کر آئی۔۔۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی بس سے نیچے اترا۔۔۔ پیروں کے نیچے سنگلاخ زمین شاید اتنی نہیں تپ رہی تھی۔ جتنا سینک میرے تن سے اٹھ رہا تھا۔۔۔ تپتے جلتے وجود نے مجھے ایک پل وہاں نہ کھڑا ہونے دیا اور میں پیدل چل پڑا۔ جیسے باقی کا ڈیڑھ گھنٹے کا سفر انہی قدموں پہ تو طے کروں گا۔

تیرے عشق نچایا۔۔۔
کر تھیا تھیا تھیا۔۔۔
تیرے عشق نچایا۔۔۔

پندرہ بیس منٹ شاید پندرہ صدیوں پہ محیط ہو گئے تھے۔

"کوئی اور۔۔۔ کوئی اور۔۔۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ کوڑے مجھے ننگے بدن پہ پڑتے اور چابک کھائے گھوڑے کی طرح میں سرپٹ بھاگنے لگتا۔

اور پھر سامنے سے آتے ٹرالر کو دیکھ کے میں نے یونہی لفٹ کا اشارہ بھی کر دیا۔ نہیں۔۔۔ میں تھکا نہیں تھا اس وقت تھکن کا احساس ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر میں جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ خلاف امید چارے سے بھرے اس ٹرالر میں بھی جگہ دے دی گئی اب میں ایک گھنٹے تک وہاں پہنچ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اچھے دوستوں میں۔۔۔ اور پھر بچپن کے دوستوں میں جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔"

وہ دیوار پہ لکھے اپنے اور اس کے نام پر محبت سے ہاتھ پھیرتی جنید کو بتا رہی تھی۔

"ہم بھی خوب لڑتے ہیں اور پھر مان جاتے ہیں۔ پھر جھگڑے کے بعد ہونے والی صلح پہ سعد اپنا اور میرا نام یہاں لکھتا ہے اور تاریخ بھی۔"

بتاتے بتاتے وہ مڑی اور ہنس پڑی۔

"بدھو۔"

"لگتا ہے جیسے آپ دونوں زیادہ تر جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔۔۔ سب دیواریں بھر چکی ہیں یعنی ہر بار نئے سرے سے ہونے والی دوستی کی روایت ہے یہ۔"

"یہی سمجھ لیں۔"

"تو ایک نئی دوستی کی شروعات بھی اسی روایت سے ہونی چاہیے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ زمین پہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ ام ہانی اس کی بات کا مطلب تو نہ سمجھی مگر جب اسے زمین سے ایک چاک کا ٹکڑا اٹھا کے سیدھا ہوتے دیکھا تو چونک گئی۔

"ہوں۔۔۔ تو آج ڈیٹ کیا ہے؟"

وہ چاک کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے دیوار پہ خالی جگہ تلاش رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ پلیز۔۔۔ جنید۔" وہ گھبرا گئی مگر جنید نظر انداز کرتا ایک کونے میں اپنا نام لکھنے لگا۔

"جنید۔۔۔" وہ احتجاجاً چلا اٹھی۔

"جھگڑا نہیں ہوا تو کیا ہوا۔۔۔ مگر دوستی تو ہوئی ہے آج۔"

"ہاں۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر آپ پلیز آپ یہاں۔" وہ گھبراہٹ کے عالم میں اب اسے اپنا نام لکھتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نام کے بالکل ساتھ۔

"چلیں دیکھتے ہیں ہم اپنا نام یہاں کتنی بار لکھیں گے۔ Hopefully زیادہ بار نہیں کیونکہ ہم بہت کم لڑیں گے۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں۔۔۔ یہ جگہ۔" وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"چلیں... اب آپ کا اسکول دیکھ لیں۔"

جیب سے رومال نکال کے ہاتھ صاف کرتا وہ آگے چل پڑا۔ ام ہانی نے چلتے چلتے مڑ کے بے بسی سے اپنے اور جنید کے نام کو دیوار پر لکھا دیکھا تھا۔ اسے یکایک ہی جنید کا ساتھ چبھنے سا لگا... فضول آدمی بلاوجہ کی بے تکلفی۔

☼ ☼ ☼

"سلمی... سلمی... او سلمی... منحوس۔"

مہ پارہ سلمی کو پوری حویلی میں پکارتی پھر رہی تھی۔ نائلہ نے دیکھ کر بتایا۔

"وہ تو صبح کی نکلی تھی حکیم سے دوا لانے کا کہہ کر ابھی تک نہیں لوٹی۔"

"کس بات کی دوا... ہٹی کٹی تو ہے اور کونسے کوہ قاف کے حکیم سے دوا لینے گئی ہے جو شام کر ڈالی آپ نے بھی ناں بھابھی۔ حد سے زیادہ چھوٹ دے رکھی ہے ملازموں کو... آپ سمجھتی کیوں نہیں... منہ زور جوانی ہے اور اس ملازم پیشہ طبقے پہ تو جوانی ویسے بھی اندھی بہری ہو کے آتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ ہاتھ ملتی رہ جائیں۔"

مہ پارہ پھر شروع ہو جاتی تو کون چپ کرا سکتا تھا۔ نائلہ نے وہاں سے کھسک لینے میں ہی عافیت جانی۔

"توبہ ہے مہ پارہ... تمہیں تو موقع چاہیے۔"

"ہونہہ... رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں اب تو حویلی کے۔" مہ پارہ ناگواری سے بھابھی کو جاتا دیکھ کے بڑبڑانے لگی۔

"کہاں تو منڈیر پہ دوپٹا تک دھو کے نہیں ڈالا جاتا تھا کہ آتے جاتے کی نظر بہو بیٹی کے آنچل پہ نہ پڑے اور اب... دیکھو تو ام ہانی کو صبح سے اس غیر مرد کے ساتھ سیر سپاٹے کرنے کے لیے چھوڑا ہوا ہے۔"

تو پیا سے مل کے آئی ہے
بس آج سے نیند پرائی ہے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

سلمی گنگناتی... بہکے قدموں کے ساتھ ڈولتی پھاٹک سے داخل ہو رہی تھی۔

"تو لاکھ چلے ری گوری..."

اور مجھے ایک دم سے اپنے سامنے دیکھ کے اس کی گنگناہٹ سہم گئی۔

"تھم... تھم... کے۔"

"سنو ہنی سکول سے آگئی؟" میں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"وہ تو جی... گئی ہی نہیں۔" حواسوں میں آتے ہوئے سلمی نے ذرا غور سے میرا جائزہ لیا۔ شاید وہ میرے بالوں میں پھنسے... اور کپڑوں پہ لگے گھاس پھوس کو دیکھ کے حیران ہو رہی تھی۔

"اندر ہے؟"

مجھے تسلی ہوئی۔ میں بھی تو ابھی ابھی آیا تھا۔ اندر نہیں گیا تھا۔

"پتا نہیں... میں صبح جب نکلی تھی حویلی سے تو وہ وہاں پیچھے کھنڈر لے کر جا رہی تھیں ولایت والے مہمان کو۔"

"کیا؟"

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو... چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا... میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا... ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی... نہ لور... مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکانے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی بڑھ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سعد رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

"تم اکیلے تو نہیں ہو... کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟"

ایک نشتر سا چلا تھا میرے دل پہ۔۔۔

اس چھوٹے سے اسکول میں چار کمرے تھے اور کوئی جماعت ایسی نہ تھی جس کے در و دیوار اس کے ہاتھ کی بنی تصویروں سے محروم ہوں۔

"یہاں کے غریب بچوں کو تعلیم دے کر مجھے سکون ملتا ہے۔ بڑے دادا نے ابو کی یاد میں یہ ٹرسٹ اسکول بنا کے ان کی روح کو بھی وہی سکون دیا ہے۔"

"تم اتنی ٹیلنٹڈ لڑکی ہو۔ بہت کچھ کر سکتی تھیں اور بہت کچھ کر سکتی ہو۔" جنید سچ مچ متاثر نظر آرہا تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ یہاں کے ڈگری کالج سے سمپل سا بی اے کرنے کے بعد تم اس اسکول میں خود کو ضائع کر رہی ہو۔" ام ہانی نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

"اگر دل کا سکون خود کو ضائع کر کے ملتا ہے تو میں خود کو بار بار ضائع کرنا چاہوں گی۔" اب جنید کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

"شام ہو گئی چلتے ہیں اب۔" وہ گھڑی پہ وقت دیکھتے ہوئے تشویش سے کہنے لگی۔

"یہاں کا Sun set دیکھنے کا بھی اپنا ہی چارم ہو گا۔ نہر کے پاس بیٹھ کے سورج کو غروب ہوتے دیکھتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ شام سے پہلے پہلے ہر حال میں واپس جانا ہو گا ورنہ پھوپھو۔۔۔"

جماعت کے دروازے پہ مجھے کھڑا دیکھ کے وہ بات کرنا بھول گئی۔ میرا آنا تو غیر متوقع تھا ہی۔۔۔ مگر شاید میری حالت نے اس کو زیادہ چونکایا تھا۔

اس ابتر سفر کے ابتر ترین حالات، میرے حلیے اور لباس سے ظاہر ہو رہے تھے۔ میلی شرٹ، بکھرے بال، تھکن، پسینہ لیکن اس کے علاوہ میرے چہرے پہ میری آنکھوں میں جو بہت سے شکوے رقم تھے۔ وہ اسے زیادہ ہراساں کر رہے تھے۔

"سعد۔۔۔"

اس نے پکارا۔۔۔ مگر میرے اندر اس پکار نے بھی آج شگوفے نہیں کھلائے۔۔۔ میری نظریں یونہی شرر برساتی رہیں۔۔۔ جنید مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر میں ذرا توجہ نہیں دے رہا تھا اس پہ۔۔۔ اور نہ ہی ام ہانی۔۔۔ وہ تشویش سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔

"کیا ہوا سعد؟ تم ٹھیک ہو؟ یوں بتائے بنا اچانک؟"

اسے میرے اچانک آنے پہ تشویش تھی۔۔۔ میری نظروں کے گلے شکوے اسے سمجھ نہیں آرہے تھے۔ میں اور تپ گیا ایک سلگتی ہوئی نظر میں نے جنید پہ ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جانے لگا۔ وہ مجھے پکارتی پیچھے تک آئی تھی۔

"سعد۔۔۔ سنو تو کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" یہ پوچھنے کی ضرورت باقی تھی اب۔۔۔ میں تقریباً بھاگتا ہوا اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔ پھر میں نے دروازہ لاک کر دیا۔ کیوں بتاتا میں اسے کہ کیا ہوا؟ خود جانے۔۔۔ خود سمجھے۔۔۔ ناراض ناراض سا اب میں دروازے کو دیکھتا جا رہا تھا۔

اب ہو گی دستک۔

ابھی ہو گی۔۔۔

بس۔۔۔ آئی ہو گی وہ۔

☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)